وارث علوی کا تنقیدی اسلوب

ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری

C/11، مہاویر فلیٹس، راجپور ٹولنا کا، گومتی نگر، احمد آباد (گجرات)، موبائل: 9558931762

تنقید ایک اعلیٰ فن پارہ ہے اور یہ کام اس شخص کا ہے جو اپنے اطراف کے تمام تخلیقی ادب کے سمندر کا عمیق مطالعہ رکھتا ہو۔ اگر یہ بات وارث علوی کے لیے کہی جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وارث علوی اُردو کے تنقیدی دبستان کا ایک درخشاں نام ہے۔ حالانکہ کئی مرتبہ وارث علوی کی تنقید پر سوالیہ نشان بھی اُٹھتے رہے ہیں۔ کسی نے اُنھیں بے لگام نقاد کہا، تو کسی نے ٹیڑھے نقاد سے موسوم کیا تو کسی نے وارث علوی کو سرے سے نقاد کی حیثیت سے ہی خارج کر دیا۔ موصوف کو اپنے تعلق سے لوگوں کی اس بات کا شدت سے احساس تھا۔ اسی لیے اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اپنی بھی ایک ادبی خواہش یہی تھی کہ شرفائے ادب کی مانند ہمارے پاس بھی تنقید کی ایک سفید گھوڑوں والی بگھی (تانگہ) ہوتی جو صرف شاعروں کی صد سالہ برسی کے موقع پر اصطبل سے باہر نکلتی اور جس پر ہم مردِ مومن کی طرح بیٹھے فلک الافلاک کی باتیں کرتے اور ایک ادائے خاص سے لوگوں کا سلام جھیلتے گزر جاتے، لیکن کیا کریں اپنا اپنا مقدر ہے۔''[1]

وارث علوی کے مذکورہ بیان کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ تنقید جو بظاہر ادب کا ایک خشک شعبہ ہے، لیکن وارث علوی نے ادب کے اس خشک شعبے میں اپنی خالص تنقید کے ساتھ اپنی شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور راست گوئی سے ایک ایسی جاذبیت اور دلکشی پیدا کر دی تھی جو قاری کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم ضرور بکھیر دیتی تھی اور وہ ان تحریروں میں مسحور ہو جاتا تھا۔ جب کہ تنقید میں شگفتہ مزاجی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور نہ ہی بذلہ سنجی کا کوئی عمل دخل ہوتا ہے تاہم اس بات سے انکار نہیں کہ وارث علوی ایک وسیع المطالعہ ادیب ہونے کے ساتھ ایک سخت قسم کے جری نقاد تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ وارث علوی کی تنقیدی سختی کی بنیاد راست گوئی پر مبنی ہے جہاں راست گوئی کے ساتھ بعض مرتبہ شگفتہ مزاجی بھی در آتی ہے، لیکن وہیں ان کی تنقید میں کسیلے، سخت اور پر خار جملے بھی موجود ہوتے ہیں۔ جو ادب کے خالق کو بعض مرتبہ ناگوار بھی محسوس ہوتے رہے ہیں۔ وارث علوی تخلیق شدہ ادب کی تنقید میں کسی طرح بھی جانب داری کے قائل نہیں۔ اُن کا رویہ بالکل غیر جانبدارانہ ہوتا ہے اور وہ نہایت باریک بینی سے فن کا مشاہدہ کر کے اپنی رائے قلم بند کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ تنقید کے حوالے سے وارث علوی کا نقطۂ نظر یہ تھا:

> ''تنقید رابطہ ہے قاری اور قاری کے درمیاں، اپنی آخری شکل میں تنقید گفتگو ہے اہلِ علم کی اہلِ علم سے، اہلِ دل کی اہلِ دل سے، خوش طبعی ہے یاروں کے بیچ، بے تکلفی ہے احباب کے درمیاں، بحث و تکرار ہے ہم مشربوں سے، چھینا جھپٹی ہے مخالفوں سے اور پھکڑ اور ٹھٹھول ہے حریفوں سے۔''

علوی کے مطابق تنقید اپنی آخری شکل میں ایک اہلِ علم کی اہلِ علم سے گفتگو ہے۔ اس لحاظ سے تنقید تخلیقِ ادب کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی ہے۔ مغربی نقاد ''کرامیو، اسکاٹ اور جیمس وغیرہ کے کہنے کے مطابق ''کوئی ادبی تخلیق تنقید کے بغیر ممکن نہیں۔''[2] اس لیے وارث علوی کا نظریہ ہے کہ دوسرا اہلِ علم تخلیق کار کے فن پارے سے اتفاقِ رائے رکھتا ہو یہ ضروری بھی نہیں۔ کیوں کہ ایک تخلیق کار جب اپنی نوکِ قلم سے کسی ادب یا فن پارے کو حیاتِ جاویداں عطا کرتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ اس کا تخلیق کردہ ادب شرفِ قبولیت کے کس معیار پر رکھا جائے گا یا یہ کہ تنقید کے کن مراحل سے گزر کر یہ فن پارہ اپنے معیار کے حقیقی مقام کو پہنچے گا۔ اس سے قطع نظر بعض مرتبہ تخلیق کار داد و تحسین کا مشتاق بھی نظر آتا ہے۔ ایسے موقع پر وارث علوی جیسا سخت نقاد جو ادب پارے کے جمالیاتی حسن کو پرکھنے میں اپنی مثال آپ ہیں سے جب سابقہ پڑتا ہے تو بالکل غیر جانب دارانہ اسلوب بروئے کار لاتے ہوئے موصوف اپنی تنقیدی انفرادیت سے اس تحریر کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنی آرا قلم بند کرتے ہیں اور اس تنقیدی رویہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ان کا قلم بعض مرتبہ ادبی حدود کو بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی کی تنقید اور ''مسدس حالی'' کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> ''اُن کا گھوڑا اخلاقیات کی لید بہت کرتا تھا۔ اُدھر ہندوستان جمالیات کی راہ پر چلنا چاہتا تھا۔ نوجوان شاعر لب کھول رہے

تھے۔ایک پر آسمانوں کے اور دوسرے پر رانوں کے رازعیاں ہورہے تھے۔ایک کونسوانی بدن اور دوسرے کو ربّانی وطن چاہئے تھا۔موسل اور مسلمانی کا یہ دَور دَورہ دیکھا تو خواجہ صاحب بہت سٹپٹائے۔لوگوں نے بھی دیکھا کہ جب تک پانی پت کا یہ مولانا موجود ہے، حقیقی اور مجاز کی دونوں معشوقوں سے وصل کے مزے لوٹنا محال ہے۔''[۳]

وارث علوی اپنی تنقیدی جراحت کی انفرادیت میں عصرِ حاضر کے معاصر ناقدین کی تنقیدی نگارشات کی تنقیدی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کا اظہار بالکل بے باکی سے کرتے ہیں اوراس بے باکی میں ان کا لہجہ بعض مرتبہ جارحانہ اور بے رحمی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی جیسے معتبر نقاد جب ''افسانے کی حمایت میں'' قلم اُٹھاتے ہیں تو وارث علوی جیسا سخت نقاد اس کے جواب میں ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' لکھ کر اپنی تنقیدی آتش بازی سے فاروقی صاحب کی تحریروں کی نفی کر دیتا ہے:

''فاروقی نے اپنی کتاب ''افسانے کی حمایت میں'' افسانے کو اسی طرح رگیدا ہے جس طرح کسی زمانے میں کلیم الدین احمد نے غزل کو رگیدا تھا۔افسانے پر اُن کی تنقید غلط بھی ہے اور کینہ پرور بھی۔انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اس میں خلوص نہیں محض اتراہٹ، دھونس اور رعونت ہے۔''[۴]

اسی طرح وارث علوی اُردو ادب کے دیگر نقادوں کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، وزیر آغا، وحید اختر، شمیم حنفی، محمد حسن، سید محمد عقیل اور پروفیسر قمر رئیس وغیرہ کی ادبی آرا، تنقیدی تصورات اور نظریات پر بے لاگ ہو کر اپنی ناقدانہ صلاحیتوں سے نہایت بیباکی اور پر ظرافت انداز میں تنقید کرتے ہیں۔وارث علوی کی تنقید سے اس بات کا معترف ہونا پڑتا ہے اُردو کے مذکورہ نقادوں کی تنقیدی نگارشات کا اُنھوں نے کتنی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی تنقیدی تخلیقات کے تجزیے سے ان کے تنقیدی معیار کی ایک تفہیم اپنے ذہن میں قائم کرتے ہوئے اُسے ایک ''گاڑی'' (سواری) سے تشبیہ دیتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

(۱) کلیم الدین کے یہاں اکڑ نہیں تھی، ٹھسہ نہیں تھا، اتراہٹ نہیں تھی۔بناوٹ، دھونس اور رعونت نہیں تھی۔اُن کی تنقید کی ''گاڑی'' (جسے وہ لندن سے خرید کر لائے تھے) جیسی تھی اُس میں وہ نفاست سے بیٹھتے اور سبق پڑھانے چل دیتے۔سبق کے دوران اردو شاعری اور اردو تنقید سب ملیامیٹ ہو جاتی، لیکن کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ شخص شرارت کر رہا ہے، دھاندلی مچا رہا ہے، بُت شکنی کر رہا ہے، اپنی بلند جبیں یا آرٹی شخصیت کی نمائش کر رہا ہے۔وہاں کوئی Pretense (مکر، حلیہ، بہانہ) نہیں تھا۔شخصیت پر کوئی ملمع نہیں تھا۔

(۲) وحید اختر کے پاس سفید گھوڑوں والی بگھی (تانگہ) ہے۔میرا خیال ہے علی گڑھ کا ہر پروفیسر ایسی بگھی رکھتا ہے۔

(۳) محمود ہاشمی کے پاس اسکوٹر ہے۔اُن کے کک کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔

(۴) آل احمد سرور کے پاس ایک سائیکل ہے جو تنے ہوئے رسّے پر اپنا توازن قائم رکھتی ہے۔

(۵) باقر مہدی کے پاس بھی ایک سائیکل ہے۔جسے اُنھوں نے پطرس سے خریدا ہے۔روزانہ اسے ولایتی کتابوں کا تیل پلاتے رہتے ہیں، لیکن چلاتے گاہے، ماہے، سرراہے ہی ہیں۔

(۶) شمیم حنفی کے پاس ٹرانسپورٹ کا ایک ٹرک ہے جس میں مغرب کے تمام فلسفیوں کو لاد کر وہ کاٹھ کے الوؤں کو فلسفہ پڑھانے نکل جاتے ہیں۔

(۷) شمس الرحمٰن فاروقی کے پاس بھی تنقید کی گاڑی ہے۔ماڈل نہ پوچھئے کیونکہ کالرج اور چارڈز سے لے کر علم بیان کے تمام اساتذہ کے پرزے اس میں لگے ہوئے ہیں۔ڈرائیونگ کا انداز بالکل Plyboy کا ہے۔

اردو کے ان عظیم نقادوں کی تنقید پر وارث علوی کی مذکورہ آرا یا بیانات ان کے منفرد تنقیدی انداز بیان کو علویت بخشتے ہیں اور اُردو تنقید کو نئے امکانات سے روشناس کراتے ہیں۔حالانکہ وہ دہلی، لکھنؤ اور علی گڑھ یا دکن کے اردو کے بڑے ادبی مراکز سے بے حد دُور اُفتادہ اُردو کے معاملے میں نہایت خشک ''احمد آباد۔گجرات'' جیسے ایک خطے میں آباد تھے۔تاہم ان کی تنقیدی انفرادیت نے اُن کے نام کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بجا رکھا تھا۔

تنقید میں وارث علوی کا نظریہ یہ تھا:

''تخلیقِ ادب کے دوران ایک تخلیق کار کو کسی خاص نظریے کے حصار میں رہنا تخلیقی عمل کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔''

وارث علوی نے اپنے منفرد تجزیاتی شعور کی بنا پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ...''ہماری تنقید خالص تنقید ہے ہی نہیں ان میں بیشتر تنقیدیں غیر ضروری مدح سرائی اور بے جا عیب جوئی سے آگے نہیں بڑھ سکی ہیں۔وارث علوی کا خیال ہے کہ آج تنقید نگار ایک ایڈوانس تصور فکر اور خاکہ ذہن میں رکھ کر اپنی تنقید کو ضابطۂ تحریر میں لاتا ہے جو تنقید، تنقید نہ رہ کر صرف مدح سرائی کے عناصر سے پُر ہو جاتی ہے۔وہ ادیب کے باطن میں

ایک جرأت مندی اور شفاف ذہنیت کے متلاشی ہیں۔ حالانکہ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''میں یہ نہیں کہتا کہ تنقید میں رواداری نہیں برتنی چاہئے، لیکن آدمی رواداری برتے تو سب کی طرف برتے اور گر سخت گیری کرے تو اپنے اور غیروں کی تفریق سے دُور رہنا چاہئے۔ کیونکہ اگر تنقید منصفانہ نہیں تو دو کوڑی کی چیز ہے۔''

وارث علوی خالص تنقید کے حامی تھے اور چونکہ وہ تنقید میں بالکل غیر جانبدار واقع ہوئے تھے۔ اس لیے وہ جب کبھی ایسے جعل ساز، ناقص، سرقہ کیے ہوئے یا مدح سرائی سے پُر حمایت سے مغلوب تنقیدی ادب کو دیکھتے تو اُنھیں سخت اذیت ہوتی۔ ایسی جانب دارانہ ناقص تحریریں ادب کے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں جس سے علوی بہت سخت متنفر تھے اور جو ان کے لیے باعث کرب کے سوا اور کچھ بھی نہیں اسی لیے موصوف کہتے ہیں:

''پریم چند کو ''گورکی'' اور انیس کو ''شیکسپیئر'' ثابت کرنے والے اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ ہزار منطق کے زور پر آپ گھر کی جورو کو ہالی ووڈ کی حسینہ ثابت کر دیں، رہے گی تو وہ جورو ہی۔''[۵]

اس لیے وارث علوی ایسی خواہش کے متمنی نظر آتے ہیں کہ ایک تخلیق کار کو اپنی تمام خداداد صلاحیتوں اور ذہنی قوتوں اور بصیرتوں کو روبہ عمل لا کر ارفع خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں وارث علوی بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنی خودستائی، مدح سرائی یا ناموری کے قائل نہیں تھے اسی لیے اُنھوں نے خود پر پی ایچ۔ ڈی۔ کی کسی کو اجازت نہیں دی۔ اُن کے نزدیک پی۔ ایچ ڈی کے مقالات کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

''ہر ذی روح کی طرح ایک مدرس بھی عمرِ دراز کے چار دن مانگ کر لاتا ہے۔ دو پی۔ ایچ ڈی کے موضوع کی تلاش میں اور دو موضوع پر کام کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔''

اُردو میں ہونے والے پی۔ ایچ ڈی کے تحقیقی مقالوں کی گراوٹ اور سطحیت پر ایک فکر انگیز چوٹ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''کعبہ کو صنم خانے سے پاسباں ملیں گے تو کعبہ کا یہی حال ہوگا۔''[۶]

دراصل وارث علوی خود کے ذہنی معیار و اَفکار کے عین مطابق کسی ریسرچ اسکالر کے متمنی تھے اور پھر چونکہ ان کے معیار پر کوئی بڑی مشکل سے ہی پورا اُترتا اس لیے وارث علوی پر راقم سمیت پی۔ ایچ ڈی کے خواہاں کسی ریسرچ اسکالر یا کسی پروفیسر کی مُراد بر نہ آسکی۔ شاید اسی لیے علوی پر اکا دکا پی ایچ۔ ڈی۔ کے تحقیقی مقالے کے سوا کوئی اور ادبی کتب منظر عام پر نہیں آسکیں۔ اس ضمن میں وہ رقم طراز ہیں:

''پروفیسر نقاد آرٹی نقاد بن چکا ہے اور پروفیسر کا آرٹی نقاد بننا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا نوجوان کا مولوی بننا اور مولوی کا شاعر بننا۔''[۷]

یوں تو وارث علوی بڑے ہی خوش مزاج واقع ہوئے تھے اور یہی خوش مزاجی اُن کی تحریروں میں بھی در آئی تھی۔ اپنے بلند تنقیدی نظریات کی بنیاد پر وارث علوی نے بڑے بڑے ادیبوں کی تحریروں کو ایسی ظرافت سے رد کر دیا تھا کہ اُن کے ادبی معیار ہی مشکوک ہو کر رہ گئے۔ حالانکہ اُن کے اسی انفرادی رویے اور سخت تنقیدی اسلوب کی زیرِ لب چہ میگوئیاں اور اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں، لیکن اسی منفرد اسلوب میں اُنھوں نے اعلیٰ ترین تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ منشا صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میرے افسانے ''مرگ زار'' نے وارث علوی جیسے ٹیڑھے نقاد کی تحسین پائی ہے۔ وارث علوی مشکل سے ہی کسی کو تسلیم کرنے والے تھے۔ اُنھوں نے میرے افسانے ''مرگ زار'' کی تکنیک کو سراہا ہے۔''

اُردو تنقید میں خصوصاً فکشن کی تنقید میں وارث علوی کی انفرادیت اُن کے منفرد لب و لہجے کے برملا اظہار میں تھی۔ اُنھوں نے جس طبع کی بنیاد رکھی اور اپنا جو انفرادی طرزِ اسلوب اختیار کیا وہ اُردو ادب میں معدوم ہے۔ انھوں نے اُردو فکشن پر بھرپور تجزیاتی مضامین قلم بند کئے ہیں اور اس طرح کے اس سے پہلے نہ کسی نے اس ضمن میں اس شان سے لکھا اور نہ ہی اُن کے ہم عصروں میں کسی نے اس اسلوب کو اپنایا ہے۔ ان کا یہ اسلوب ادب میں اپنی انفرادی شناخت کا حامل ہے۔ اردو تنقیدی ادب میں اُن کے متعلق یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اس منفرد لہجے و اسلوب کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی ہیں جس نے اُردو فکشن کی پیمائش کے لیے ایک نئی راہ کی بنیاد قائم کی جو ان کے نام کا امین ہے۔

مآخذ

۱۔ فکشن کی تنقید کا المیہ، وارث علوی، ص: ۷
۲۔ ادبی تنقید (ڈاکٹر عصمت جاوید) ص: ۱۲
۳۔ فکشن کی تنقید کا المیہ، وارث علوی، ص: ۷
۴۔ فکشن کی تنقید کا المیہ، وارث علوی، ص: ۱۲
۵۔ فکشن کی تنقید کا المیہ، وارث علوی، ص: ۱
۶۔ فکشن کی تنقید کا المیہ، وارث علوی، ص: ۷
۷۔ فکشن کی تنقید کا المیہ، وارث علوی، ص: ۷

◆◆◆

◆◆◆